جناب رحمت فرخ آبادی ایم۔ اے

مقدمۂ بغاوت کراچی اور مولانا محمد علی جوہر

ـــــ تیسری اور آخری قسط ـــــ

مولانا محمد علی جوہر کے بیان کے بعد مندرجہ ذیل فرد جرم ملزموں کو پڑھ کر سنائی گئی۔

آج بتاریخ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۲۱ء کو بی، سی، کینڈی، آئی، سی، ایس جوڈیشل کمشنر سندھ کی عدالت میں مندرجہ ذیل افراد (۱) محمد علی رام پوری، (۲) حسین احمد مدنی دیوبندی (۳) ڈاکٹر سیف الدین کچلو امرتسری (۴) پیر غلام مجدد سرہندی مٹیاری (۵) مولانا نثار احمد کان پوری (۶) بھاوتی کرشنا تیرتھ جی (۷) شوکت علی رام پوری۔ جنھیں ایس، ایم، ٹلاٹی، سٹی مجسٹریٹ کراچی نے سشن سپرد کیا تھا، پیش کیے جاتے ہیں۔

(الف) اور آپ ساتوں ملزم کسی وقت یا اوقات میں فروری ۱۹۲۰ء تا ستمبر ۱۹۲۱ء کے درمیان کراچی اور برطانوی ہند کے دیگر مقامات پر مسلمان افسروں اور سپاہیوں کو فوجی ملازمت سے باز رکھنے کی سازش میں شریک تھے اور آپ نے دفعہ ۱۲۳ ب / دفعہ ۱۱۵ اور ۱۳۱ تعزیراتِ ہند کے تحت قابلِ تعزیر جرم کا ارتکاب کیا، جس کی سماعت کا سشن کورٹ کو اختیار ہے۔

(ب) مزید برآں ملزم نمبر ۱ محمد علی نے غالباً ۹ر جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں اس قسم کے الفاظ کہے کہ "اس وقت ہر مسلمان کے لیے برطانوی فوج میں ملازم رہنا یا بھرتی ہونا یا دوسروں کو بھرتی ہونے کی ترغیب دینا مذہباً ناجائز ہے۔" ان الفاظ سے ملزم کا یہ ارادہ تھا یا اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ مسلمان افسر اور سپاہی اپنی اپنی ملازمتوں سے سبکدوش ہو جائیں۔ اس طرح ملزم زیرِ دفعہ ۵۰۵ تعزیراتِ ہند کے قابلِ تعزیر جرم کا مرتکب ہوا، جس کی سماعت اس عدالت کے دائرۂ اختیار میں ہے۔

(ج) اور یہ کہ مندرجہ سازش کی تائید اور حمایت میں جولائی یا اگست ۱۹۲۱ء کے دوران سازشی جماعت کے ایک رکن یا ارکان نے مسلمان افسروں کو ملازمت چھوڑ دینے کی ترغیب دی اور ان میں کتابچے تقسیم کیے جو عدالت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ گویا اس طرح انھوں نے زیرِ دفعہ ۱۲۰/۱۰۹ اور

۱۲۱ تعزیراتِ ہند جرم کا ارتکاب کیا جس کی سماعت کا اس سشن کورٹ کو اختیار ہے۔

(د) اور یہ کہ ملزم ۲ سے ۷ تک نے ملزم نمبر ایک کے ساتھ سازش کرکے اسی کی طرح زیرِ دفعہ ۵۰۵ تعزیراتِ ہند مذکورہ بالا جرم کا ارتکاب کیا ہے، اس لیے وہ زیرِ دفعہ تعزیراتِ ہند ۱۰۹/ ۵۰۵ مجرم ہیں، اور اس کی سماعت کا اس کورٹ کو اختیار ہے۔

(ﮦ) ملزم نمبر ایک محمد علی نے غالباً ۹ر جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں زیرِ دفعہ ۵۰۵ یا دفعہ ۱۳۱ تعزیراتِ ہند جس جرم کا ارتکاب کیا ہے، اس کے ساتھ اس جرم میں دس سے زیادہ افراد شریکِ کار رہے ہیں۔ ملزم نے آل انڈیا خلافت کانفرنس کراچی میں اپنی تقریر میں کہا کہ "تمام مسلمانوں کا بالعموم اور تمام علما کا بالخصوص یہ فرض ہے کہ وہ (مذہبی احکام کا حوالہ دیتے ہوئے) ان الفاظ کو ہر مسلمان فوجی ملازم کے ذہن نشین کرادیں۔ اس طرح ملزم زیرِ دفعہ ۱۱۷ تعزیراتِ ہند قابلِ تعزیر جرم کا مرتکب ہوا، جس کی سماعت اس عدالت کے اختیار میں ہے۔

(و) مزید یہ کہ ملزم نمبر ۲ سے ملزم نمبر ۷ تک نے ملزم نمبر ایک محمد علی کے ساتھ سازش کرکے اور اس طرح کی زیرِ دفعہ ۱۱۷ تعزیراتِ ہند مذکورہ جرم کا ارتکاب کیا ہے، اسی لیے وہ بھی زیرِ دفعہ ۱۰۷/ ۱۰۸ تعزیراتِ ہند قابل تعزیر جرم کے مرتکب ہیں، جس کی سماعت کی یہ عدالت مجاز ہے۔

اس کے بعد عدالت نے ملزموں سے ارتکابِ جرائم کے بارے میں پوچھا کہ آیا وہ مرتکب ہوتے ہیں یا نہیں، تو سب نے اقبالِ جرم سے انکار کیا۔ پھر ارکانِ جیوری کے ناموں کا اعلان ہوا، جس میں مندرجہ ذیل پانچ افراد شامل تھے۔

(۱) مسٹر دیارام گدومل (۲) مسٹر ڈی، سوزا، سی (۳) مسٹر رام چند تلسی داس (فورمین)
(۴) مسٹر ڈی کرز آر (۵) مسٹر کرینچل ڈی

ارکانِ جیوری کے ناموں کے اعلان کے بعد وکیلِ استغاثہ نے عدالت سے خطاب کیا اور اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کے بیانات ہوئے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ابتدائی سماعت کی عدالت میں استغاثہ نے تیس گواہ پیش کیے تھے، لیکن سشن میں ان میں سے مندرجہ ذیل گواہوں کو پیش نہ کیا۔

۱۔ مسٹر کیشو لال مصودا اس گومانی۔ ہیڈ کانسٹیبل کراچی پولیس۔

۲۔ جے رام داس۔ صوبیدار۔ ۹۸ انفنٹری بڑودہ۔
۳۔ محمد ہاشم صوبیدار ۱۰۶۔ پائنیر کوئٹہ۔
۴۔ مسٹر کیکی، پی، اے۔ ڈپٹی کمشنر پولیس بمبئی۔
۵۔ مسٹر ڈھولا رام نروان ماروا ڑی، سب انسپکٹر سی، آئی، ڈی، پونا۔
۶۔ مسٹر موٹوانی نمائندہ اخبار ڈیلی نیوز ٹائمز۔ کراچی۔
۷۔ سید عبدالکریم انسپکٹر سی آئی ڈی پولیس۔ مدراس۔
۸۔ مسٹر اسمارٹ ڈبلیو، ڈبلیو۔ ڈسٹرکٹ میجسٹریٹ کراچی۔

البتہ مندرجہ ذیل چار نام ہمیں ملتے ہیں، جنھیں استغاثے نے صرف سشن کورٹ ہی میں پیش کیا۔

۱۔ فرینک بروسٹر۔ سرکاری ماہر فنِ تحریر شملہ۔
۲۔ پھول چند۔ سب انسپکٹر پولیس، پونا
۳۔ سندر ناتھ سین ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس، سلہٹ۔
۴۔ محمد حسین صوبیدار۔ ۱۰۶۔ ہزارہ ازکوئٹہ۔

سشن کورٹ کی سماعت کے دوسرے دن مورخہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۱ء کا اہم واقعہ یہ ہے کہ سماعت شروع کرنے کے لیے جب جج عقب کے دروازے سے کمرۂ عدالت میں داخل ہوا تو سامعین کی اکثریت اس کے احترام میں کھڑی ہو گئی لیکن علی برادران اور ان کے رفقا اور سامعین کی کچھ تعداد بیٹھی رہی، چنانچہ جب جج نے خشم گین نگاہوں سے ملزموں کی طرف دیکھا تو انھیں مطالعہ میں مصروف پایا۔ اس پر اس نے سرشتہ دار سے کہا کہ وہ ملزموں کو عدالت کے احترام میں کھڑے ہونے کا حکم دے، لیکن انھوں نے سرشتہ دار کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر جج نے ان کی کرسیاں اٹھا لینے کا حکم دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے فوراً چند کاغذات زمین پر بچھائے اور ان پر بیٹھ گئے اور مولانا محمد علی نے اپنا کوٹ فرش پر بچھا دیا اور اس پر شنکر اچاریہ سے بیٹھنے کو کہا۔ ایک دفعہ پھر جج نے رہنماؤں کو کھڑے ہونے کا حکم دیا، جسے انھوں نے نہ مانا۔ اس پر پولیس سپرنٹنڈنٹ سے جج نے کہا کہ وہ ملزموں کو زبردستی کھڑا کرے۔ جب وہ مولانا محمد علی کے پاس آیا اور جج کے الفاظ دہرائے کہ عدالت کے احترام میں کھڑے ہو جاؤ، تو انھوں نے کہا کہ اگر ہمیں حکومت کا احترام ہوتا تو اس عدالت

میں ہم پر یہ مقدمہ کیوں چلایا جاتا، جج جو چاہے کرے ہم خود کھڑے ہونے کو تیار نہیں، وہ ہمیں صرف جبر اور طاقت ہی سے کھڑا کر سکتا ہے۔ اس پر جج نے کہا کہ اگر تم نے اپنی ہی بات پر زور دیا تو میں تم پر توہین عدالت کے الزام میں مقدمہ چلاؤں گا۔ اس سلسلے میں ضیاء الدین احمد برنی لکھتے ہیں کہ مقدمہ کراچی میں سرکاری وکیل نے جس سے مولانا کی پرانی شناسائی تھی، آخر ایک دن پوچھ ہی لیا کہ مسٹر محمد علی میں دیکھتا ہوں کہ آپ جج کی آمد پر کھڑے نہیں ہوتے، حالانکہ آپ دیکھتے ہیں کہ میں خود کھڑا ہو جاتا ہوں تو مولانا محمد علی نے جواب دیا کہ آپ کو تو اس بات کی فیس ملتی ہے[1]

اسی طرح تیسرے دن یعنی ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۱ء اور مابعد جب ملزم رہنمایانِ قوم کمرۂ عدالت میں داخل ہوئے تو پچھلے دن کی طرح فرش پر ہی بیٹھ گئے اور سامعین کی اکثریت نے بھی ان کی پیروی کی۔

بعد میں جب جج نے ملزم رہنمایانِ قوم سے جرح کرنا چاہی تو سب نے یہی جواب دیا کہ اگر ہمارا بیان نہیں لیا جائے گا تو ہم کسی سوال کا جواب نہ دیں گے۔ یہ تمام کارروائی خلافِ قانون اور ناجائز ہے۔ اس طرح استغاثے کی طرف سے شہادتوں کے ختم ہونے کے بعد عدالت نے ملزموں سے اپنی صفائی پیش کرنے اور گواہ پیش کرنے کو کہا تو سب نے انکار کر دیا اور مولانا محمد علی نے کہا کہ میں ارکانِ جیوری کو مخاطب کرنا چاہتا ہوں، مجھے افسوس ہے کہ عدالت نے مجھے بیان دینے کی اجازت نہیں دی۔

سشن کورٹ کے اجلاس کے چوتھے دن کی کارروائی ۲۷ اکتوبر کو ہوئی، اس دن وکیلِ استغاثہ نے ملزموں کے خلاف الزامات کے ثبوت میں ساڑھے تین گھنٹے تک دلائل اور گواہوں کے بیانات کے حوالے دیے تعزیراتِ ہند کی متعلقہ دفعات پر اظہارِ خیال کیا۔

وکیلِ استغاثہ کی بحث کے ختم ہونے کے بعد مولانا محمد علی نے ارکانِ جیوری کو خطاب کیا۔ مولانا محمد علی جوہر کا یہ خطاب زبردست اہمیت کا حامل ہے۔ یہ خطاب دوسرے دن بھی جاری رہا۔ اس سلسلے میں حسن ریاض لکھتے ہیں کہ جیوری کے سامنے محمد علی نے دو روز تقریر کی۔ عجیب تقریر، عظیم تقریر، فصاحت و بلاغت میں بے نظیر، دلائل و براہین میں لاثانی۔ جس وقت مولانا محمد علی کی یہ

---

[1] سہ ماہی نقوش لاہور۔ شخصیات نمبر جلد دوم صفحہ ۱۱۶۱

تقریر شائع ہوئی تو سب نے کہا کہ جیوری کے سامنے سقراط کے ایڈریس کے بعد یہ دوسرا ایڈریس ہے[۵۲] درحقیقت مولانا محمد علی جوہر کے اس خطاب کو مقدمات کی تاریخ کا شاہ کار کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنے اس خطاب میں مقدمے کی نوعیت کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ مقدمہ یاس انگیز حد تک کمزور ہے اور اس میں بے بنیاد شہادتیں پیش کی گئی ہیں اور یہ کہ یہ مقدمہ ان کے اور ان کے رفقا کے خلاف نہیں بلکہ خدا اور بندے کے درمیان ہے۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ:

"مجھے اپنی صفائی پیش کرنا منظور نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت بھی نہیں، کیونکہ یہ مقدمہ ہمارے خلاف نہیں خود حکومت کے خلاف، اس جج کے خلاف، حکومت کی طرف سے مقدموں کی پیروی کا جو نظام ہے، اس کے خلاف اور اس تمام قانون کے خلاف ہے جس کے تحت یہ مقدمہ چلایا جارہا ہے۔ اس وقت جو مسئلہ زیر بحث ہے بہت صاف اور واضح ہے، چنانچہ اس سلسلے میں، میں نے ماتحت عدالت میں بھی حکومت کا شکریہ ادا کیا تھا کہ وہ پہلی بار کھلے بندوں ہمارے سامنے آئی اور اس نے ہمارے لیے ایک اور موقع فراہم کردیا کہ ہم اس سے ایک صاف اور صحیح مسئلے سے متعلق فیصلہ کرا سکیں۔ یہ صاف اور صریح مسئلہ ہے کہ برطانوی رعایا کے لیے خدا کا قانون زیادہ اہم ہے یا بادشاہ کا قانون، یعنی ایک انسان کا قانون . . . اس مسئلے پر بہت حد تک دنیا کی تاریخ کا دارومدار ہے کہ اس مہذب صدی میں انسان کا حکم زیادہ قابل اطاعت ہے یا خدا کا۔ مقدمے کا عنوان محمد علی اور اس کے ساتھی ایک طرف اور برطانوی حکومت دوسری طرف نہیں، بلکہ خدا ایک طرف اور انسان دوسری طرف ہے، یعنی یہ مقدمہ خدا اور بندے کے درمیان ہے"۔

انھوں نے کہا کہ سارا سوال یہ ہے کہ کیا ملکہ وکٹوریہ کے اعلان سے مسلمانوں کے مذہب کی حفاظت ہوتی ہے یا نہیں۔ میرا دعویٰ یہ ہے اور میں اس کے بارے میں آپ کا فیصلہ چاہتا ہوں کہ اگر ہم ایک مسلمان سپاہی کو برطانوی فوج کی نوکری چھوڑ دینے کو کہیں اور مسلمانوں کو برطانوی فوج میں بھرتی ہونے سے روکیں اور ہم یہ ثابت کردیں کہ ایسا کرنے کا حکم ہمیں قرآن کریم نے دیا ہے تو نہ ہم قانون کی گرفت میں آسکتے ہیں اور نہ آپ ہمیں سزا دے سکتے ہیں، یعنی جہاں تعزیرات ہند اور قرآن پاک ایک دوسرے کے خلاف نہیں پڑتے وہاں تو تعزیرات ہند کا حکم مسلّم، لیکن جہاں تعزیرات ہند

پاکستان ناگزیر تھا۔ ص ۱۱۵

احکام قرآنی کے خلاف ہو جائے، وہاں تعزیرات ہند کا حکم نہیں چل سکتا ۔ یہ ہے ہمارا مقدمہ۔ اگر میں اپنے اس دعوے میں غلطی پر ہوں تو جج مجھے بتا دیں، میں مطمئن ہو جاؤں گا۔

اپنے اس جیوری کے خطاب میں مولانا محمد علی نے مذہبی آزادی کی اہمیت بھی بیان کی اور اس بات پر بھی زور دیا کہ ملکہ وکٹوریہ، شاہ ایڈورڈ اور شاہ جارج نے اپنے اعلانات میں ہماری مذہبی آزادی کے تحفظ کا وعدہ کیا ہے اور یہ بھی کہا کہ "جب مجھے اپنے ملک میں سوراج مل جائے گا تو میری کوشش یہ ہوگی کہ کوئی شخص میرے ہم وطنوں کو ان کے خدا اور اس کے عاید کردہ احکام سے ورغلانے کی کوشش نہ کر سکے، لیکن جب تک میں برطانوی ہند میں رہتا ہوں، میرا حق ہے کہ میں ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کے نام پر اپنے مذہب کی حفاظت کا مطالبہ کروں۔ اگر میں ہندو ہوتا تو بھی میں یہی کہتا۔" انھوں نے یہ بھی کہا کہ "ہم آقاؤں کی تبدیلی نہیں چاہتے کہ انگریز نکلیں تو کوئی اور طاقت ہمارے سروں پر سوار ہو جائے۔ بے شک ہم اس ملک میں جلد از جلد ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں کہ جو متحدہ ہندوستان کے لوگوں کے سامنے جواب دہ ہو۔"

مجرمانہ سازش کے تحت معاہدہ کرنے کے الزام کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا محمد علی جوہر نے کہا کہ:

"مجرمانہ سازش کے سلسلے میں ہم پر آپس میں معاہدہ کرنے کا جو الزام ہے، اب اس کی حقیقت بھی سنیے۔ کسی آدمی نے، کسی ایک آدھ گواہ نے بھی یہ نہیں کہا کہ اس نے ہمیں آپس میں سازش کرنے یا جرم کو ارتکاب کرنے کے لیے معاہدہ کرتے ہوئے دیکھا یا سنا یا اسے ہم پر اس کا شک ہوا۔ میں فروری ۱۹۲۰ میں انگلستان میں تھا اور غالباً خاص اسی دن جس دن کلکتہ میں خلافت کانفرنس ہوئی اور اس میں یہ قرارداد منظور کی گئی، میں قائم مقام وزیر ہند سے مل رہا تھا۔ یہ ہے میرے خلاف مجرمانہ سازش کرنے کی شہادت۔ شاید اسی لیے جرم کو ثابت کرنے کے لیے بجائے ثبوت کے محض قیاس آرائی سے کام لیا گیا۔

انھوں نے مزید کہا کہ اسی طرح دو اور ملزم جو ہماری طرح کٹہرے میں موجود ہیں، ان کو بھی اس خلافت کانفرنس میں اس قرارداد پر تقریر کرنے سے پہلے آپس میں معاہدہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ان حضرات سے تو مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ اس خاص مسئلے سے متعلق شریعت کا حکم بتائیں، چنانچہ وہ انھوں نے بتا دیا اور اس میں فوج کے بارے میں جو کچھ تھا وہ کسی فعل کے کرنے کا ارتکاب نہ تھا بلکہ اسلام کے ایک قانون کا اعلان تھا اور بس۔ اب آپ ہی اندازہ لگا لیجیے کہ اس سے مجرمانہ سازش کے لیے معاہدہ کرنے کا ثبوت

کہاں سے آگیا۔"

مولانا محمد علی جوہر نے آل انڈیا خلافت کانفرنس کراچی کی اس قرارداد کو جو اس مقدمے کی بنیاد تھی ایک مستقل عزم اور پکے ارادے کا فیصلہ قرار دیا اور پھر دفعہ ۵۰۵ کے تحت جو الزام لگایا گیا تھا، اس کی وضاحت کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ خدا سے وفاداری ہر چیز پر مقدم ہے۔ پھر تاریخ کے حوالے سے یہ بھی ثابت کیا کہ آج کے مجرم کل کو سزاوارِ تحسین ہوا کرتے ہیں، اور پھر اپنے خطاب کے آخر میں کہا کہ "مجھے بادشاہ سے کوئی ذاتی عناد نہیں اور نہ جج سے اور نہ حکومت ہی سے۔ میری پبلک تقریروں میں سے ایک مثال بھی میرے اس دعوے کے خلاف پیش نہیں کی جا سکتی۔ حضرات! اور یہ ٹھیک بھی نہیں۔ ہمیں اپنے اعمال میں پبلک کے بھلے کو پیش رکھنا چاہیے نہ کہ کسی سے اپنی ذاتی پرخاش کو۔ . . حضرات! ہم دونوں بھائیوں کے نام حضرت علی کے متبرک نام پر رکھے گئے ہیں، اور میرے نام کا ایک جزو تو اس ذات کے نام پر ہے جو حضرت علی سے بھی بڑی ہے، میں اپنی ذاتی پرخاش کے لیے تو ایک راکھشش کو بھی قتل کرنے میں شریک نہیں ہو سکتا لیکن خدا کے لیے تو میں ہر ایک کو قتل کر سکتا ہوں اور کسی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اپنے بھائی کو قتل کر سکتا ہوں، اپنی پیاری بوڑھی ماں کو، اپنی بیوی کو اور اپنے بچوں کو سب کو خدا کے لیے اور خدا کی راہ میں قتل کر سکتا ہوں ——— خدا مجھے اس کی توفیق دے۔ (جب مولانا محمد علی جوہر ان الفاظ پر پہنچے تو ان کی آواز بھرا گئی اور ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور وہ بالکل نڈھال ہو کر بیٹھ گئے)۔

مولانا محمد علی جوہر کے خطاب کے بعد بالترتیب مولانا حسین احمد مدنی اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے ارکانِ جیوری سے خطاب کیا، اور مقدمے کی کارروائی کے چھٹے دن یعنی ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو پیر غلام مجدد سرہندی، مولانا نثار احمد کان پوری، شری شنکر اچاریہ اور مولانا شوکت علی نے خطاب کیا۔ ہم طوالت کے خوف سے ان رہنماؤں کے بیانات سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔

مقدمے کی کارروائی کے ساتویں دن یعنی یکم نومبر ۱۹۲۱ء کو عدالت کے سررشتہ دار نے فردِ جرم ارکانِ جیوری کو پڑھ کر سنائی۔ پھر جج نے ارکانِ جیوری سے خطاب کیا، اس کے بعد ایک بج کر دس منٹ پر عدالت نے جیوری کو صلاح مشورے کے لیے وقت دیا۔ چنانچہ ساڑھے تین بجے عدالت کا اجلاس دوبارہ ہوا، تو جیوری کے سرپنچ مسٹر رام چند تلسی داس نے جج کے دریافت کرنے پر ارکانِ جیوری کی طرف

سے کہا کہ دفعہ ۱۳۱ اور ۱۲۰ (ب) کے بارے ارکانِ جیوری کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ملزموں میں سے کسی پر بھی نہ تو ملک معظم کی فوج کے سپاہیوں کو ورغلانے کی سازش کا الزام ثابت ہوتا ہے اور نہ کسی سپاہی کو فوج کی خدمت سے روکنے کا، اس لیے ہماری رائے میں جملہ ملزم بے قصور ہیں۔ چنانچہ جج نے جیوری کے اس فیصلے سے اتفاق کرتے ہوئے دفعہ ۱۳۱ اور ۱۲۰ (ب) کے جرائم سے ملزموں کو باعزت طور پر بری کر دیا۔

بقایا دفعات کے بارے میں سر پنج نے کہا کہ اس سلسلے میں دیارام گدومل کی رائے یہ ہے کہ تمام ملزم جملہ الزام سے بے قصور ہیں لیکن ہم چار کی متفقہ رائے یہ ہے کہ سوامی شنکر اچاریہ کے سوا باقی تمام ملزم دفعہ ۵۰۵ اور ۱۰۹ قصوروار ہیں اور مولانا محمد علی پر دفعہ ۱۱۷ کا جرم بھی ثابت ہے۔ ارکانِ جیوری نے اس بات کا بھی اعلان کیا کہ انھوں نے فیصلہ کرتے وقت ملزموں کے مذہبی عقائد کو ملحوظ نہیں رکھا۔ چنانچہ جج نے ارکان جیوری کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے سوامی شنکر اچاریہ کو تو بری کر دیا لیکن باقی تمام ملزموں کو دو دو سال قید بامشقت کی سزا دی اور مولانا محمد علی کو زیر دفعہ ۱۱۷ مزید دو سال کی سزا کا حکم سنایا لیکن یہ شرط عاید کر دی کہ دونوں سزائیں ایک ساتھ شروع ہوں گی۔

قید بامشقت کی سزا عام طور پر سول عدالتیں، سیاسی رہنماؤں کو سیاسی مقدمات میں نہیں دیتی ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں وزیرِ ہند مسٹر مانٹیگیو کی ذاتی درخواست پر جو انھوں نے ۳ر نومبر ۱۹۲۱ء کو وائسرائے سے کی، قید سخت کی پابندی ختم کر دی گئی، لیکن اس کا باضابطہ اعلان نہ کیا گیا، کیونکہ وائسرائے کے خیال میں ایسے اعلان سے تحریک ترک موالات کو بڑی تقویت ملتی۔[۳]

مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی پر الگ الگ زیر دفعہ ۱۲۴ اور ۱۵۳، ایک اور مقدمہ چلایا جانے والا تھا، لیکن حکومت نے ان مقدموں کو واپس لے لیا اور ان کی سماعت کی نوبت نہ آئی۔

مولانا محمد علی جوہر اور ان کے رفقا سینٹرل جیل کراچی میں غالباً فروری ۱۹۲۲ تک رہے، اس کے بعد کراچی سے منتقل کر دیئے گئے۔ اس عرصے میں ان پر کیا بیتی؟ اس بارے میں سر حاجی عبداللہ ہارون نے ۸ فروری کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نام لکھا کہ "ان کو کھانا اچھا نہیں ملتا اور اس وجہ سے جیل

---

۳ Life and Times of Muhammed Ali by Afzal Iqbal, Lahore 1974, Pp 278-279.

میں کم مقدار میں کھاتے ہیں۔ کل سے جیل میں سب قیدیوں نے اسٹرائیک کی ہے۔ سنا ہے مولانا شوکت علی اور ان کے ساتھیوں سے برا برتاؤ دیکھ کر کی ہے۔ اللہ اکبر کے نعروں کی آواز دور دور سے سننے میں آتی ہے[۵۴]

اسی طرح ۱۰ فروری کو اس افواہ پر کہ علی برادران کو قتل کر کے جیل کے احاطے میں دفن کر دیا گیا ہے، ایک جم غفیر جس کا کوئی لیڈر نہ تھا جمع ہوگیا، چنانچہ فساد کو روکنے کے لیے مولانا محمد علی نے اُن کے سامنے تقریر کی اور واپس جانے کی درخواست کی۔ ۲۸ فروری کو مولانا شوکت علی، ڈاکٹر کچلو، مولوی نثار احمد کانپوری اور پیر غلام مجدد سرہندی سے برہنہ ہو کر تلاشی دینے کو کہا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ پھر ۳۰ فروری کو ان کی زبردستی تلاشی لی گئی[۵۵]

بہرحال کراچی کے قیدی کچھ روز بعد الگ الگ کر دیے گئے۔ مولانا شوکت علی راجکوٹ گئے محمد علی کے حصے میں بیجاپور (دکن) کا جیل آیا۔ بیجاپور کے قیدی کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اگر ناوقت اُسے چھینک آجاتی تو اس کی بھی برقی تاریں دوڑنے لگتیں۔ اسی طرح دم کے دم میں یہ خبر بھی ملک کی فضا میں گونج جاتی[۵۶] اسی طرح پیر غلام مجدد سرہندی کو رتناگری جیل بھیجا گیا۔ انھوں نے جس خندہ پیشانی سے رتناگری جیل میں یہ عرصہ گزارا، اس کی وجہ سے انھیں پورے برصغیر میں شہرت حاصل ہوگئی[۵۷] اور مولانا حسین احمد مدنی کو سابرمتی جیل احمد آباد گجرات میں داخل زنداں کیا گیا۔ وہاں ان پر جو کچھ بیتی اس کا تذکرہ مولانا حسین احمد مدنی نے اپنے ایک خط مرقومہ رمضان ۱۳۳۸ھ میں مولانا زاہد حسین صاحب امروہہ کے نام کیا ہے[۵۸]

بہرحال اگست ۱۹۲۳ء کی آخری تاریخیں تھیں کہ جب مولانا کو قیدِ فرنگ سے رہا ہوئے۔ بیجاپور جیل

---

۵۴ سہ ماہی نقوش۔ خطوط نمبر حصہ دوم، ص ۱۱۰

۵۵ Life and Times of Muhammad Ali, Page 283-284.

۵۶ محمد علی۔ ذاتی ڈائری کے چند اوراق جلد اول۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی ۱۹۵۴ء اعظم گڑھ، ص ۱۰۳، ۱۰۵۔

۵۷ جنب گزار یمرجن جلد اوّل۔ جی، ایم، سید۔ حیدرآباد ۱۹۶۷ء، ص ۲۱۱، ۲۱۲۔

۵۸ مکتوبات شیخ الاسلام جلد دوم۔ مرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی۔ دیوبند ۱۳۷۳ھ، ص ۸۰، ۸۲۔

سے چپ چاپ جھانسی لائے گئے اور یہاں اسٹیشن پر چھوڑ دیے گئے۔ ملک بھر میں ایک جشن مسرت و شادمانی برپا ہوگیا اور لوگوں نے بے حد خوشی منائی۔ ملک کی کیسی کایا پلٹ ان دو برسوں میں ہوگئی، اس کا اندازہ خود مولانا محمد علی کے ایک مضمون سے کیجیے جو کئی سال کے بعد جنوری ۱۹۲۹ء کے ہمدرد میں ان کے قلم سے نکلا۔ انھوں نے لکھا کہ "ہمارے قید ہوتے ہی ہندو مہاسبھائی مہاراشٹر نے مہاتما گاندھی اور عدم تعاون کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ خود مہاتما گاندھی نے حکومت کو الٹی میٹم دے چکنے کے بعد بارڈولی میں وہ روش اختیار کی جسے ملک نے ہتھیار ڈالنے کے مترادف سمجھا اور وہ خود بھی ہماری طرح قید کر دیے گئے۔ ان کے قید ہوتے ہی پنڈت موتی لال نہرو اور دیش بندھو داس آں جہانی آزاد ہوئے اور بجائے سول نافرمانی شروع کرنے کے جس کا یارش بخیر اب پھر کلکتہ میں نام لیا گیا ہے، گیا میں سوراج کے نام سے وہ علم بغاوت بلند کیا جس نے عدم تعاون کی تحریک کا خاتمہ کر دیا۔ پھر لطف یہ کہ ہندو مہاسبھائیوں نے شدھی اور تنگھٹن کی تحریکیں شروع کیں، جنھوں نے مذہبی تعصبات کی آگ کو بھڑکا دیا، جنھیں ہم ٹھنڈا کر چکے تھے اور ان کے جواب میں مسلمانانِ پنجاب میں اسی عنصر نے وہ زبانی جمع خرچ تبلیغ و تنظیم کے نام سے دکھانا شروع کیا جو آج وطن پرستی اور ملت شکنی کا ڈھول بجا رہا ہے۔ اس طرح ہمارا کیا کرایا کام اکارت گیا اور جب مجھے جیل خانے ہی میں اس کا احساس ہوا تو میں نے اس طرح اظہار کیا کہ:

یہ حالت ہوگئی ہے، ایک ساقی کے نہ ہونے سے کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے

یہ تھی وہ روداد چمن جو دوسری گرفتاری سے رہائی پر میں نے سنی[۵۹]

لیکن گاندھی جی نے یہ تحریک اس طرح اچانک کیوں ختم کی، کیا گورکھ پور کے موضع چورا چوری کے حادثے سے وہ زیادہ متاثر تھے۔ اس بارے میں تجزیہ کرتے ہوئے مولانا حسن ریاض لکھتے ہیں کہ اس کا سبب یہ تھا کہ مسلمان تحریک میں بڑی قوت کے ساتھ شریک تھے۔ خود کانگریس کے نظام میں ان کا غلبہ تھا اور خلافت کے معاملے میں ان کے ساتھ صریح زیادتی کرنے کے بعد حکومت اس تلاش میں تھی کہ کسی طرح اس نقصان کی تلافی کر کے مسلمانوں کے دل سے اس کی تلخی کو رفع کرے۔ لہٰذا یہ قرینہ تھا کہ

---

۵۹ محمد علی۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق۔ جلد اوّل، ص ۱۱۶، ۱۱۷

ملک کے آئندہ سیاسی بندوبست میں وہ مسلمانوں کے مطالبات کو وقعت کی نظر سے دیکھتی۔ مسٹر گاندھی کو یہ منظور نہ تھا، اس لیے انھوں نے سمجھوتے کی ہر تجویز مسترد کر دی اور پھر تحریک کو یکایک اس لیے بند کیا کہ کانگریس اور ملک کی سیاسی سرگرمیوں میں مسلمانوں کا جو دخل ہو گیا تھا، وہ ختم ہو جائے۔[۱]

اس طرح راجا غضنفر علی خاں نے ان خیالات کا اظہار کیا کہ خلافت کمیٹی اور کانگریس کی مشترکہ تحریک عدم تعاون کے زمانے میں مسلمانوں نے وقتی طور پر اس سوال کو پس پشت ڈال دیا تھا جو سر سید احمد خاں اور سید امیر علی کے وقت سے ان کے سیاسی تدبر کا جزو بنا ہوا تھا کہ ہندوستان کی جمہوری آزادی کے نظام میں مسلم اقلیت کی پوزیشن کیا ہو گی؟ جو تحریک علما کے اس فتوے کے تابع تھی کہ مسلمانوں کے لیے انگریزی حکومت کے ساتھ ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس تحریک کے لیے سیاسی نفع و نقصان اور عواقب و نتائج کے متعلق سوچ بچار کا کیا سوال پیدا ہو سکتا تھا۔ جہاں تک مولانا محمد علی جوہر کے اندازِ فکر کا تعلق تھا، اس کا بغور مطالعہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مسلم قوم کے مستقبل کا سوال کسی مرحلے پر بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھا، لیکن وہ دو باتوں میں امتیاز کرتے تھے، اگر کسی انقلابی تحریک کے ذریعے ہندوستان میں انگریزی حکومت کو ختم کیا جا سکے تو مولانا اس کے مابعد کا خطرہ مسلم قوم کے نقطۂ نگاہ سے قبول کرنے کو تیار تھے، لیکن اگر بظاہر انقلابی تحریک کا مقصد صرف یہ ہو کہ انگریزی حکومت پر دباؤ ڈال کر اس کے ہاتھ سے آزادی کا آئین حاصل کیا جائے اور نافذ کرایا جائے تو پھر مولانا کے خیال کے مطابق اس آئین میں مسلمانوں کی جگہ پہلے سے متعین کرانے کا مطالبہ لامحالہ درست اور ضروری تھا۔[۲]

بہرحال تحریکِ خلافت کا دور برصغیر میں مسلمانوں کے لیے نہایت نازک دور تھا۔ تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون میں تمام ہندو اور مسلمان رہنما گرفتار کر لیے گئے اور باہر رہنے والی تیسرے درجے کی قیادت اس قابل نہ تھی کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دے سکتی۔ تحریک خلافت کی ناکامی کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک دوسرے پر ذمہ داری ڈالنے کے بارے میں مختلف رہنماؤں نے مختلف زاویۂ نگاہ اختیار کیا ہے،

---

[۱] پاکستان ناگزیر تھا، سید حسن ریاض۔ ص ۱۵۳

[۲] مارشل لا سے مارشل لا تک۔ مرتبہ سید نور احمد۔ لاہور ۱۹۷۰ء۔ طبع چہارم، ص ۴۰

لیکن پھر بھی اقتصادی طور پر یہی نتیجہ برآمد ہوا کہ اس تحریک سے مسلمان خسارے میں رہے، انھوں نے بڑی تعداد میں ملازمتوں سے استعفے دیے، جائیدادیں کوڑیوں کے مول بیچیں اور مکمل عدم تعاون کی راہ اختیار کی، جبکہ ہندوؤں کا تعلق نہ ہجرت سے تھا اور نہ وہ ترکِ موالات کو مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ ہندو اور مسلمانوں کے اس نظریاتی فرق سے انگریز نے فائدہ اٹھایا اور ہندو اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے منصوبے بنائے، چنانچہ جو سامراج مولانا محمد علی جوہر کو مذہبی آزادی تک نہ دے سکا، اس نے ہندوؤں کی انسداد گاؤکشی، شدھی اور شنگھٹن کی تحریکوں کو مکمل آزادی دی، اور اس طرح اس دور میں ہندوؤں کی مختلف تنظیموں نے ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ان ہی تحریکوں کے نام پر ملک کے طول وعرض میں ہزاروں مسلمانوں کا خون بہایا۔ یہ ملک گیر فسادات اتنے دردناک تھے کہ ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے داعی مولانا محمد علی جوہر کو بھی علی گڑھ میں کہنا پڑا کہ "اگر مسلمانوں اور ہندوؤں میں خوں ریزی اسی طرح جاری رہی تو ہندوستان، ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا میں تقسیم ہو جائے گا"[۱۲]

---

[۱۲] تاریخ نظریۂ پاکستان۔ پیام شاہجہان پوری۔ لاہور ۱۹۷۰ء۔ ص ۲۷۹۔

معارفِ حدیث اردو ترجمہ معرفۃ علوم الحدیث

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی

"معرفۃ علوم الحدیث"، فنِ حدیث میں ایک بڑی گراں قدر تصنیف تسلیم کی گئی ہے۔ اس کے مصنف امام ابوعبداللہ الحاکم نیساپوری (۳۲۱ھ - ۴۰۵ھ) ہیں۔ اس میں احادیث کی قسمیں، راویانِ حدیث کے مراتب اور ان کے حالات، نیز اس سلسلے کی دوسری معلومات سب آگئی ہیں۔ اس کتاب سے فنِ حدیث کا کوئی طالب علم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ترجمہ بڑا شگفتہ اور رواں ہے۔

صفحات ۳۸۸ قیمت = ۱۳ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور